دھنک کے رنگ
عزیز اللہ خاں عزیز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دھنک کے رنگ

(بچوں کی کہانیاں)

از

عزیز اللہ خاں عزیز

○ کتاب: دھنک کے رنگ (بچوں کی کہانیاں)

○ کہانی کار: عزیز اللہ خاں عزیز

○ ناشر: جنتا بک سینٹر۔ پنجوسرائے سنبھل

○ اشاعت: سنہ ۲۰۰۴ء

○ صفحات: ۶۴

○ سرورق: شکیل انوار صدیقی

○ کتابت: محمود علی

○ طباعت: اِشتہار آفسیٹ پریس۔ دہلی

○ قیمت: پچاس روپئے 50

(۱) جنتا بک سینٹر۔ نزد پولس چوکی، پنجوسرائے سنبھل ۲۴۴۳۰۲

(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

(۳) ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

(۴) دانش محل۔ امین آباد۔ لکھنؤ

عظیم فن کار و قلمکار

شکیل انوار صدیقی

کے نام

جنھوں نے اپنے قلم کی جنبش سے سیکڑوں
کہانیوں کو زندگی بخشی!

عزیز
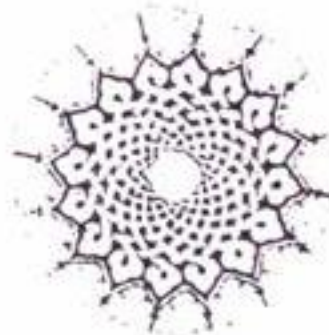
ترتیب

حرفِ چند

ہمارے ملک میں دادی یا نانی کے ذریعے بچوں کو کہانی سنانے کا رواج بہت پرانا ہے۔ خاص طور سے سردی کے موسم میں بڑی بوڑھی عورتیں گھر کے بچوں کو شام سے ہی لحاف میں لے کر بیٹھ جاتی ہیں تاکہ بچے ٹھنڈ سے محفوظ رہیں۔ اُس وقت وہ بچوں کا دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لئے اُن کی پسند کے مطابق ایسی کہانیاں سُناتی ہیں جن سے ان کی ذہنی نشو و نما بھی ہو اور تفریحِ طبع بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہانی سے بچوں کا ابتدائی تعلق ہے۔

بچوں کی کہانیاں مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے بچوں میں اوصافِ حمیدہ کی تخم ریزی کی جاتی ہے۔ کہانی میں کردار، واقعہ یا خیال پر اس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے کہ وہ سچ نہ ہو کر بھی سچ معلوم ہوتی ہے۔ کہانی تاریخی بھی ہو سکتی ہے، مذہبی بھی، وہ حقیقی بھی ہو سکتی ہے اور خیالی بھی۔ اس کا عنوان پُرکشش، آغاز دلچسپ اور انجام پُراثر و نیز نصیحت آمیز ہونا چاہیئے۔ اس کا پلاٹ مرتب اور تجسس کا حامل ہونا چاہیے۔ قاری کے ذہن میں آخر تک تجسس اور اشتیاق برقرار ہے۔ بچوں کی کہانیوں میں پیچیدہ اور اُلجھاؤ دار پلاٹ مناسب نہیں۔

پیشِ نظر کتاب ـــــ "دھنک کے رنگ" ـــــ بچوں کی کہانیوں کا ایک خوب صورت مجموعہ ہے۔ جس میں شامل کہانیوں سے بچوں میں دوستی، وفاداری، ایثار اور

ہوشیاری جیسے جذبات کو اُبھارا گیا ہے۔ نیز لالچ، شرارت اور عصبیت سے باز رہنے کی تلقین نہایت حسین انداز میں کی گئی ہے۔ آسان اور صاف ستھری زبان استعمال کر کے مصنف نے اَدبِ اطفال کے فنّی تقاضوں کا لحاظ بھی رکھا ہے۔ اور بیان کی چستی کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کہانیوں کے عنوانات بچّوں کے حساب سے موزوں اور مناسب ہیں۔ مجموعے میں شامل ساتوں کہانیاں سماجی و اصلاحی ہیں۔ مکالمے فطری اور چست ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنّف کو کہانی کہنے کا سلیقہ بھی ہے اور شوق بھی۔

سنبھل میں یوں تو کئی لوگوں نے بچوں کے لئے کہانیاں لکھی ہیں اور بعض اب بھی لکھ رہے ہیں جن میں راقم الحروف کے علاوہ محمود اسرائیلی، ڈاکٹر صابر سنبھلی، مظفر حسین غزالی، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، تسکین زیدی اور خوشحال زیدی کے نام بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے "عزیز اللہ خاں عزیز" بچوں کے لیے اپنی کہانیوں کا مجموعہ "دھنک" کے رنگ" لے کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ثابت قدم رکھے اور ان کا ذوقِ سلیم برقرار رہے۔

۱۲؍ نومبر ۲۰۰۳ء

جلال افسر سنبھلی
مدیر اُتر پردیش اُردو تعلیمی جائزہ کمیٹی

پیش لفظ

بچوں کے لئے لکھنا بظاہر نہایت آسان ہے۔ لیکن اسی آسانی میں افہام و تفہیم کی وہ دشواری پوشیدہ ہے، جس سے تخلیق کار ہی واقف ہوتا ہے۔ ضروری ہوتا ہے کہ تخلیق کار جو عمر اور ذہنی سطح کے اعتبار سے بچوں سے کہیں بلند ہے، وہ بچوں کی ذہنی سطح پر آئے، ان کی دلچسپیوں اور رنگا رنگ سوچ پر گرفت حاصل کرے اور پھر خود اپنے بچپن کی بازیافت کرے۔ تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ بچوں کے لئے بہتر طریقے پر آسان زبان میں اُن کی پسند کے مطابق لکھ سکے۔

عزیز اللہ خاں عزیز کا ـــــ دھنک کے رنگ ـــــ کے عنوان سے ست رنگی کہانیوں کا یہ مجموعہ مذکورہ بالا سطور کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے یہ کہانیاں بچوں کی ذہنی سطح، ان کی ہمہ رنگ دلچسپیوں کے پیشِ نظر تحریر کی ہیں۔ اور بچوں کی اخلاقی تربیت کا مقصدِ عظیم اُن کا کمالِ تخلیق ہے۔

انھوں نے اپنی تمام کہانیوں میں نہایت عام فہم زبان و بیان کا انداز اختیار کیا ہے۔ انھیں کہانی کے فن کا پورا عرفان ہے اور بچوں کی نفسیات، دلچسپیوں

ضرورتوں، اور جذبات سے واقفیت بھی۔ اسی لیے ان کی کہانیاں تاثر اور دلچسپی سے
بھرپور رہیں۔ اس مجموعے کی ایک کہانی بھی ایسی نہیں جو بچّوں کے لیے دلچسپی
سے خالی ہو۔ مستقبل میں ان کے قلم میں مزید نکھار آئے گا۔

مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ بچّوں میں نہایت مقبول ہوگا۔

انشاء اللہ

۱۲ر اکتوبر ۲۰۰۳ء

عبدالباری وسیم
مدیر : "ہلال" رام پور

اپنی بات

کہانیاں سننا شاید دنیا کے تمام بچوں کا ہر زمانے میں مشترکہ شوق رہا ہے ۔
ہر بچے کی طرح مجھے بھی یہ شوق تھا۔ کہانیاں سنتے سنتے میں بھی کہانیوں میں کھو جاتا،
پھر اسی عالم میں نیند مجھے اپنے آغوش میں لے لیتی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر کہانیاں
سننے کا یہ شوق کہانیاں کہنے اور سنانے میں بدل گیا ۔ بہت سی جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ کر
میں اپنے ہم عمر بچوں کو سنانے لگا۔ یہ کہانیاں کسی قابل بھی ہیں اس کا پتہ تب چلا جب
میں نے ان کو صفحۂ قرطاس پر لکھا اور میرے احباب نے ان کو کسی رسالے یا اخبار میں اشاعت
کے لئے بھیجنے کی تحریک دی۔ جب بچوں کے رسالوں کے مدیروں نے ان کو اپنے رسالوں
کے صفحات کی زینت بنا کر میرے حوصلے کو تقویت بخشی، بچوں اور دوسرے قارئین نے ان
کو پسند کیا تو حوصلہ اور بڑھا۔ اس طرح بہت سی کہانیاں جمع ہو گئیں جن میں سے کئی
کہانیاں بچوں کے معروف رسالوں ــــ "اچھا ساتھی"، "نونہال"، "ہلال"، "اُمنگ"،
"گل بوٹے"، "عالمی سہارا" وغیرہ میں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔

اب ہمت اور بڑھی اور یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ان میں سے چند کہانیوں کا انتخاب
کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے تاکہ بچے اور ادبِ اطفال کے قارئین ان کو یکجا طور پر پڑھ
سکیں۔ احباب نے اس خیال سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے

کے لئے بار بار تقاضا اور اصرار بھی کیا۔ جس کے نتیجے میں ـــــ "دھنک کے رنگ" آپ کے پیشِ نظر ہے۔ برادر مکرم سید خلیق احمد، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور محترم محمد سعود صاحبان کے تقاضے نہ ہوتے تو شاید یہ ارادہ اتنی جلد عملی شکل اختیار نہ کرتا۔

استاد محترم وقار رومانی، جناب عابد حسین صاحب حیدری، جناب بشارت زردغ صاحب رام پوری، جلال افسر سنبھلی، نفیس احمد سنبھلی، جناب معوان الحق اور نظام الدین نظام وغیرہ حضرات کی حوصلہ افزائیاں اور رہنمائیاں ہمیشہ مجھے حاصل رہی ہیں جن کے لیے میں ممنون ہوں۔ ساتھ ہی جناب عبدالباری وسیم (مدیر "ہلال" رام پور)، مولانا سراج الدین ندوی (مدیر "اچھا ساتھی" بجنور) جناب عزیز برنی (مدیر "عالمی سہارا" و "راشٹریہ سہارا" دہلی) وغیرہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری ان قلمی جسارتوں کو اپنے رسائل کے قیمتی صفحات میں جگہ دے کر حوصلہ افزائی فرمائی۔

"دھنک کے رنگ" آپ کے سامنے حاضر ہے۔ اس میں سات کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں کیسی ہیں؟ ان کی خوبیوں خامیوں کا فیصلہ کرنا اہلِ نظر اور قارئین کا کام ہے۔ یہ کہانیاں پسند آئیں تو بھی اور نہ آئیں تو بھی آپ اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ آپ کی رائیں اور مشورے میرے تخلیقی سفر میں رہنما ہوں گے۔

پنجو سرائے سنبھل
۲۰ نومبر ۲۰۰۳ء

عزیز اللہ خاں عزیز

راجو نے خالد کے دروازے پر آواز دی ـــــــ

"خالد! ۔۔۔۔ خالد!! ۔۔۔۔ خالد!!! ۔۔۔۔ آج اسکول نہیں جانا ہے کیا؟"

"آرہا ہوں بھائی! ۔۔۔۔ آرہا ہوں!! ۔۔۔۔۔ ذرا سائیکل صاف کر رہا تھا" ـــــــ گھر کے اندر سے خالد کی آواز آئی۔

"لنچ باکس یاد سے رکھ لیا ہے نا؟" ـــــــ خالد نے

دروازے سے باہر سائیکل نکالتے ہوئے راجو سے پوچھا۔

"آج ممی سے آلو کے پراٹھے بنوا کر لایا ہوں" ___ راجو نے خالد کو جواب دیا۔

"آلو کے پراٹھے ؟" ___ خالد نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں آلو کے پراٹھے !!"۔۔۔ چل اب جلدی کر، اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے تجھے آلو کے پراٹھے بہت پسند ہیں !!" ___ راجو نے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

خالد اور راجو اسی طرح روزانہ ساتھ ساتھ اسکول جاتے آتے ۔ خالد کا گھر راجو کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ دونوں میں اتنی گہری دوستی تھی کہ لوگ انھیں سگے بھائی ہی سمجھتے تھے۔ عید ہو یا دیوالی دونوں ساتھ مل کر مناتے۔ اس طرح خالد اور راجو کی دوستی سارے محلے کے لئے ایک مثال بن گئی تھی۔

خالد اور راجو جس محلے میں رہتے تھے وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں وہ ایک زمانے سے رہ رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کے تعلقات میں فرق نہ آتا۔ لیکن آس پاس کے شہروں میں ہونے والے دنگوں اور جھگڑوں سے ان کے شہر میں بھی

خوف اور کشیدگی کے بادل چھا جاتے۔ ان کے محلے کے کئی لوگوں کی طرح راجو کے پاپا شرما جی نے بھی اب اپنا نیا گھر "دُرگا۔ کالونی" میں بنالیا تھا۔ اس وجہ سے خالد اور راجو کے گھر اب ایک دوسرے سے دُور ہو گئے تھے۔ لیکن گھروں میں فاصلے کے باوجود اُن کے دلوں میں پہلے جیسی ہی قُربت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے گھر ملنے کے لیے آتے جاتے رہتے۔ اس طرح دونوں کی دوستی قائم تھی۔

اِدھر کچھ دنوں سے شہر کی فضا پھر خراب رہنے لگی تھی۔ روز نئی نئی افواہیں پھیلتیں۔ ذرا سی بات پر بازار میں بھگدڑ مچ جاتی۔ دُکان دار اپنی دکانیں بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی جانب دوڑ پڑتے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم ہو جاتا۔ شہر کا ماحول خراب دیکھ کر محلے والوں نے شرما جی کو سکھانا پڑھانا شروع کر دیا کہ وہ راجو کو اکیلا خالد کے گھر نہ جانے دیا کریں۔ اِدھر خالد کے محلے والے بھی اس کے امی ابو کو نصیحت کرنے لگے کہ خالد کا دُرگا کالونی میں جانا ایسے حالات میں ٹھیک نہیں ہے.... خدا نہ کرے خالد کے ساتھ کچھ بُرا ہو جائے۔

لیکن لوگوں کی اِن باتوں کا ان کے گھر والوں پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ خالد اور راجو کی دوستی بدستور رہی اور دونوں کا ایک

دوسرے کے گھر آنا جانا چلتا رہا۔

ایک دن راجو خالد سے ملنے اس کے گھر گیا ہُوا تھا کہ اچانک کسی معمولی سی بات پر دو لوگوں میں جھگڑا ہو گیا، جس نے دنگے کی شکل اختیار کر لی۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ لوگ گھبرا کر اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑے۔ دنگائیوں نے کچھ دکانوں میں آگ لگا دی۔ ہر طرف لوٹ مار شروع ہو گئی، جو جس کے ہاتھ لگا لوٹ لے گیا۔ شہر کے ایسے حالات میں راجو کے گھر والوں کا راجو کے لئے فکر مند ہونا لازمی تھا۔

راجو کے پاپا شرما جی نے خالد کے گھر ٹیلی فون کر کے راجو کی خیریت معلوم کرنی چاہی مگر ان کا ٹیلی فون خراب تھا تب شرما جی نے اپنے پڑوسی گپتا جی کے ٹیلی فون سے خالد کے گھر بات کی۔ وہاں سے معلوم ہُوا کہ راجو تو شہر میں دنگا بھڑکنے سے پہلے ہی اُن کے گھر سے چلا گیا ہے۔ یہ بات سُن کر شرما جی گھبرا گئے۔

"کیا بات ہے، شرما جی؟---- سب خیریت تو ہے؟---
کیا راجو گھر پر نہیں ہے؟؟" ــــــ گپتا جی نے پوچھا۔

"نہیں وہ تو خالد کے گھر سے بہت دیر پہلے ہی نکل چکا ہے، خالد کے گھر والے بتا رہے ہیں!" ــــــ شرما جی نے جواب

دیا۔

"ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ راجو کو خالد کے گھر مت جانے دیا کرو، مگر آپ نے کسی کی بات نہ مانی ۔۔۔۔۔ بھگوان جانے راجو کے ساتھ کیا ہوا ہو؟" ۔۔۔۔ گپتا جی نے بڑے ہی شاطرانہ انداز میں کہا۔

کچھ ہی دیر میں راجو کے غائب ہونے کی خبر پوری کالونی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شرما جی کے گھر پر بہت سے مرد اور عورتیں جمع ہو گئے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ راجو کی ممی کا روتے روتے بُرا حال تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی رادھا! اپنے راجو کو اس محلے میں مت بھیجا کر، کسی کا کوئی بھروسہ نہیں! ۔۔۔۔ مگر تو نے میری ایک نہ مانی ۔۔۔۔۔ کر دیا نہ ان لوگوں نے راجو کو غائب؟ ۔۔۔۔۔۔ اب روتی رہ ۔۔۔۔۔۔!!" ۔۔۔۔ ایک عورت نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

اِدھر جب سے خالد کے گھر والوں کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ راجو ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچا ہے تو وہ سب فکر مند اور پریشان ہو اُٹھے تھے۔ خالد سب سے زیادہ پریشان اور بے چین

تھا۔ خالد یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ابّو اُسے اِس وقت گھر سے باہر جانے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے۔ اس لیے وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب ابّو کی نظر بچے اور وہ اپنے دوست کی تلاش میں نکلے۔

ابّو کی نظر بچتے ہی خالد نے اپنی سائیکل اُٹھائی اور راجو کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔ راستے میں جگہ جگہ اُسے آگ کے شعلے اُٹھتے دکھائی دیے۔ سڑکوں پر سنّاٹا تھا، کچھ جگہوں پر لوگوں کی ٹولیاں کھڑی تھیں۔ خالد کی نظریں راجو کو تلاش کر رہی تھیں، مگر راجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خالد دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرتا جا رہا تھا کہ راجو جہاں کہیں بھی ہو ٹھیک ٹھاک ہو۔ پریشانی کے عالم میں جلدی جلدی سائیکل کے پیڈل مار رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ سے راجو کے پکارنے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی ــــــ "خالد!۔۔۔۔ خالد!!۔۔۔ خالد!!"

خالد نے فوراً سائیکل کو بریک لگائے۔ تب تک راجو دوڑتا ہُوا خالد کے قریب آچکا تھا۔

"راجو! تو کہاں چلا گیا تھا؟" ــــــ خالد نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جب میں تیرے گھر سے واپس آرہا تھا تو راستے میں مجھے معلوم ہُوا کہ شہر میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ایک بڑی بھیڑ نے کئی جگہ آگ لگا دی۔ کچھ لوگوں کی نظر مجھ پر بھی پڑ گئی تھی، مگر میں ان سے بچ کر اس جگہ پر آ کر چھپ گیا تھا!" ——— راجو' نے کانپتی ہوئی آواز میں جلدی جلدی بتایا۔

ابھی دونوں میں بات ہو ہی رہی تھی کہ قریب سے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ——— "پکڑو! پکڑو!! مارو!..... مارو!!"

"راجو، تو جلدی سے سائیکل پر بیٹھ!" ——— خالد نے کہا۔

راجو ابھی سائیکل پر سوار بھی نہیں ہُوا تھا کہ لوگوں کی بھیڑ میں سے کسی کا ایک پتھر آ کر خالد کے سر میں لگا۔ پتھر سر میں لگتے ہی خالد کے ہاتھ سے سائیکل چھوٹ کر گر گئی۔ خالد کے سر سے خون بہنے لگا ——— لیکن خالد نے ہمت نہ ہاری۔ کانپتے ہاتھوں سے جلدی سے سائیکل اٹھائی اور راجو' سے کہا ——— "جلدی بیٹھ!"

گھبراہٹ میں راجو' کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"راجو! جلدی بیٹھ!۔۔۔۔ جلدی کر!!"ـــــ خالد پھر زور سے چلّایا۔

اب کی بار راجو سائیکل پر بیٹھ گیا۔ خالد نے سائیکل راجو کے گھر کی طرف کو دوڑا دی۔ تیزی سے سائیکل کے پیڈل مارتے ہوئے خالد کو اپنے سر سے بہتے ہوئے خون کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ پرواہ تھی تو بس اپنے دوست راجو کو حفاظت کے ساتھ اُس کے گھر پہنچانے کی۔ کچھ ہی دیر میں راجو کا گھر دکھائی دینے لگا، جہاں پر بہت سارے لوگوں کا ہجوم راجو کے انتظار میں کھڑا تھا۔

خالد کے سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ گھر کے سامنے پہنچ کر سائیکل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ وہیں بے ہوش کر گر پڑا۔

راجو خالد خالد چلّا رہا تھا اور لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ رہے تھے۔

دانش چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ امتحان نزدیک تھے، اس لیے ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ اپنے کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے کے لیے خوب محنت کر رہا تھا۔ کافی رات تک پڑھائی کرتا رہتا تھا۔ گھر میں تنگی کی وجہ سے اُس کی امّی نے اپنی اسٹیل کی اَلماری اُس کے کمرے میں رکھ دی تھی۔

دانش نے اپنی میز کرسی اِسی الماری کے قریب لگا رکھی تھی ــــــ پچھلی رات اس کا ٹیبل لیمپ خراب ہو گیا، جس کی

روشنی میں وہ پڑھا کرتا تھا۔ اسکول سے واپس آکر وہ ٹیبل لیمپ ٹھیک کرنے میں لگ گیا۔ اس کا بجلی کا تار کھلا ہوا تھا۔

اچانک دروازے کی گھنٹی بجی! اُس کی امّی نے دروازہ کھول کر دیکھا ـــــــــ سامنے ایک آدمی ہاتھ میں بڑا سا بیگ لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اُس آدمی نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا ـــــ

"میں جھاگ والا انٹرنیشنل کمپنی سے آیا ہوں، ہماری کمپنی بہت اچھا صابُن بناتی ہے، جس سے گندے کپڑے بہت آسانی سے صاف ہوجاتے ہیں!!"

"ہمیں نہیں خریدنا!.......... ہمارے پاس پہلے ہی بہت سا صابن رکھا ہُوا ہے" ـــــ دانش کی امّی نے اُس شخص سے کہا۔

"ہماری کمپنی نے یہ نیا صابن بنایا ہے اور یہ بالکل مُفت میں ہے!....... اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ گندے کپڑے آپ کو چند منٹوں میں صاف کر کے دِکھا سکتا ہوں!!"

گندے کپڑے صاف کرنے اور مُفت میں صابن ملنے کی بات سُن کر اُن کے دل میں لالچ آگیا اور انھوں نے اُس آدمی کو گھر میں بُلا لیا۔

آدمی نے اپنا بیگ زمین پر رکھتے ہوئے کہا ـــــــ "آپ میلے کپڑے لے آئیے، میں صاف کر کے دکھاتا ہوں"

جیسے ہی دانش کی امی کپڑے لانے کے لیے پیچھے کی طرف مڑیں، اُس آدمی نے اپنے پاس چھپا ہوا تیز دھار کا چمچماتا ہوا چاقو نکال کر دانش کی امی کی گردن پر رکھ دیا اور کڑک دار آواز میں کہا "اگر ذرا بھی شور مچانے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا۔ فوراً اپنے سارے زیورات اُتار کر میرے حوالے کر دو!"

دانش کی امی گھبرا گئیں اور ڈر کے مارے کانپنے لگیں۔ انھوں نے فوراً اپنے سارے زیور اُتار کر اُس کو دے دیے۔ مگر وہ آدمی اسی پر راضی نہ ہوا ـــــ اور بولا ـــــــ

"چلو اندر چل کر بتاؤ! تمھاری الماری کہاں پر رکھی ہوئی ہے؟"

مجبوراً وہ اُسے دانش کے کمرے میں لے گئیں۔ امی کی گردن پر ایک اجنبی شخص کو چاقو رکھے ہوئے دیکھ کر دانش بھی گھبرا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے گھر میں کوئی لٹیرا گھس آیا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھنے لگا تو اُس آدمی نے دانش کو دھمکاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا ـــــــ
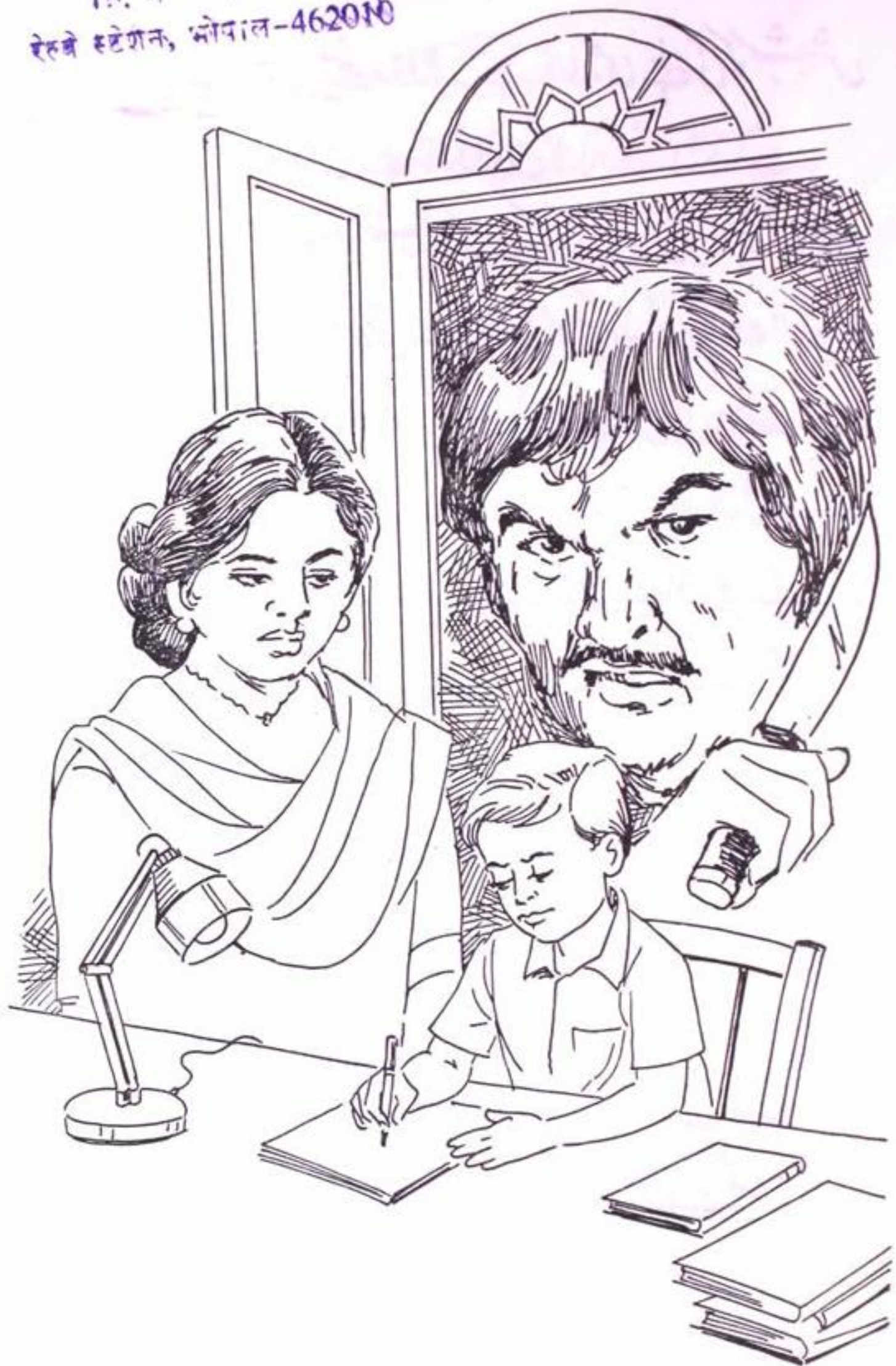
"چُپ چاپ وہیں بیٹھے رہو! ــــــ ذرا بھی ہلنے کی کوشش کی تو تمھاری امی کو جان سے مار ڈالوں گا!!"

یہ سُن کر دانشؔ خاموش پہلے کی طرح کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اُس وقت اُس کا دماغ کمپیوٹر سے بھی تیز کام کرنے لگا. وہ سوچنے لگا ابّو باجی کی شادی کا سامان خریدنے کے لیے کل ہی بینک سے پچاس ہزار روپے نکال کر لائے تھے اور وہ اِسی الماری میں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر اس لُٹیرے نے روپے لے لیے تو ابّو کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی! ــــــ اس لیے مجھے ہمّت اور عقل مندی سے کام لینا چاہیئے!!

دانشؔ کو چپ چاپ بیٹھا دیکھ کر لٹیرے نے دانشؔ کی امّی کو دھمکاتے ہوئے کہا ــــــ "الماری کی چابی کہاں ہے چابی میرے حوالے کر دو!"

دانش کی امّی نے کچھ دیر سوچا۔ پھر ڈر کے مارے مجبوراً چابی لٹیرے کے حوالے کر دی۔ اسی درمیان دانش نے ٹیبل لیمپ کا کھُلا بجلی کا تار اسٹیل کی الماری سے سٹا دیا اور کرنٹ چالو کر دیا۔

لُٹیرے نے جیسے ہی چابی لگا کر الماری کا تالا کھولنے کی

کوشش کی، بُری طرح چیخ پڑا ـــــــ کیوں کہ الماری میں دوڑ رہے کرنٹ نے اُسے چپکا لیا تھا۔

دانش نے اُسے تڑپتا ہُوا دیکھ کر رحم کھا کر بجلی کا کرنٹ بند کر دیا۔ لٹیرا بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ تب تک شور سُن کر آس پاس کے کافی لوگ آ گئے۔ دانش نے انھیں ساری بات بتا دی۔ ایک آدمی نے فون کر کے ڈاکٹر اور پولس کو بُلا لیا۔ ڈاکٹر نے آکر لٹیرے کو انجکشن لگایا تو وہ ہوش میں آ گیا۔

پولس کے پوچھ تاچھ کرنے پر اس شخص نے شہر میں پچھلے دنوں ہوئی کئی چوریوں میں اپنے گروہ کا ہاتھ ہونے کی بات قبول کر لی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ جب دو پہر کے وقت گھروں میں عورتیں اکیلی ہوتی ہیں تو اُس کے گروہ کے لوگ کسی کمپنی کا سامان بیچنے یا مُفت دینے کے بہانے گھروں میں گھُس جاتے ہیں اور لوٹ لیا کرتے ہیں۔

اس لٹیرے کی نشان دہی پر پولس نے اس کے گروہ کے لوگوں کو چوری کے بہت سارے سامان کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ اگلے دن اخباروں میں دانش

کی تصویر کے ساتھ اس کی سمجھداری کی خبریں بھی چھپیں۔ پولس افسران کی طرف سے دانش کو انعام دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔

دانش کے ابو امی اپنے بیٹے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔

روز کی طرح آج بھی بچے دادی سے کہانی سنانے کی ضد کر رہے تھے۔ دادی کی طبیعت آج کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس وجہ سے وہ طرح طرح کے بہانے بنا رہی تھیں۔

شاہ رُخ دوڑتا ہُوا آیا اور چھلانگ مار کر دادی کی گود میں بیٹھ گیا۔ شاہ رُخ کے پیچھے بھاگتا ہوا اس کا بڑا بھائی فروغ پاس آکر ہانپتے ہوئے بولا ——— "دادی جان! شاہ رُخ سے کہئے کہ وہ مجھے میری مٹھائی دے دے!"

دادی نے دونوں کی طرف دیکھا اور پوچھا ــــــ "کیا بات ہے ؟ ـــ تم دونوں کیوں جھگڑ رہے ہو ؟"

"دادی جان ! امّی نے ہم دونوں کو مٹھائی کھانے کو دی تھی، یہ فروغ میرے حصّے کی مٹھائی بھی چھین لینا چاہتا ہے. ــــــ یہ کہتا ہے، یہ مجھ سے بڑا ہے، اِس لیے اِسے مجھ سے زیادہ مٹھائی ملنی چاہیئے. ــــــ یہ ہمیشہ میری چیزیں چھین لیتا ہے !" ــــــ شاہ رُخ نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"فروغ ! یہ بات غلط ہے ! !" ــــــ وہ پیار سے بولیں۔

"لیکن میں زیادہ مٹھائی کھانا چاہتا ہوں، دادی جان !" ــــ فروغ بولا۔

"تمھیں لالچ نہیں کرنا چاہیئے ! ــــــ فروغ ! اگر تم نے یہ بُری عادت نہیں چھوڑی تو تم بھی صفدر کی طرح ایک دن پچھتاؤ گے ! !" ــــــ دادی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

سبھی بچّوں نے ایک ساتھ پوچھا ــــــــــ "صفدر کون تھا ؟ ــــ دادی جان ! اس نے کیا لالچ کیا تھا؟ ــــ ہمیں بھی اس کی کہانی سنائیے نہ ! !"

دادی نے فروغ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہانی سُنانی

شروع کر دی ـــــــــــــ

پرانے زمانے کی بات ہے، کسی گاؤں میں عبدل اپنے بیٹے صفدر کے ساتھ مزے سے رہتا تھا۔ عبدل بہت ہی محنتی تھا۔ وہ دھان کی کھیتی کرتا تھا۔ فصل بیچ کر وہ بہت روپیے کما لیتا تھا۔ وہ دھان کی کھیتی کرنے والا اُس گاؤں کا اکیلا کسان تھا۔ ـــــــ مگر پھر بھی اپنے اناج کو مناسب داموں پر ہی بیچتا تھا۔ اتنا ہی نہیں گاؤں کے غریب اور کمزور لوگوں کو مفت غلّہ دے کر اُن کی مدد بھی کرتا تھا۔ اسی لیے گاؤں کے سبھی لوگ اُس سے ہمدردی رکھتے۔

صفدر جب بڑا ہو گیا، تب وہ بھی اپنے ابّو کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانے لگا ـــــ لیکن صفدر بہت لالچی تھا۔ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپیے کما لینا چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے ابّو سے کہتا

"آپ بہت ناسمجھ ہیں۔ آپ کو زیادہ روپیے کمانے نہیں آتے۔ اس گاؤں میں ہم ہی اکیلے دھان پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہیں تو اس کی منھ مانگی قیمت وصول کر سکتے ہیں، لیکن آپ ہیں کہ ہمیشہ اناج کو کم قیمت پر بیچتے ہیں اور پھر بہت سارا

اناج مفت ہی بانٹ دیتے ہیں۔"

صفدر کی باتیں سُن کر عبدل ہنستے ہوئے کہتا —— "بیٹا! ہم اتنے ہی روپیوں میں آرام سے زندگی گزار رہے ہیں —— اور پھر اگر ہم اناج کی قیمت بڑھا دیں گے تو بہت سے غریب لوگ اناج نہیں خرید پائیں گے اور اناج ہمارے پاس بے کار پڑا رہے گا۔ —— اس سے تو اچھا ہے کہ اناج کو ہم کم داموں میں بیچ دیں۔ ہمارا اناج بھی بِک جائے گا اور غریبوں کی مدد بھی ہو جائے گی!!"

لیکن صفدر کو اپنے ابّو کی باتیں سمجھ میں نہ آتیں کیوں کہ وہ لالچی جو تھا۔ وہ ابّو کو بہت سمجھاتا اور اس موقع کی تاک میں رہتا کہ کب اسے کھیتی کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنی من مانی کرے۔

جلد ہی صفدر کو یہ موقع مل گیا ——

ایک دن عبدل سخت بیمار پڑ گیا۔ اب کھیتی کے کام کی ساری ذمے داری صفدر پر آگئی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا، کیوں کہ زیادہ روپئے کمانے کا اسے موقع مل گیا تھا۔

صفدر کا ایک اختر نام کا دوست تھا، جو اسے ہمیشہ غلط سلط باتیں بتاتا رہتا تھا۔ ایک دن اُس نے صفدر سے کہا ـــــ

"تمھارے ابّو تو بہت سیدھے ہیں، لیکن کم سے کم تم تو ہوشیاری سے کام لو۔ اِس بار تم آدھی زمین میں گنّا اُگاؤ اور آدھی میں دھان۔ گنّے کی کھیتی میں تم زیادہ کماؤگے اور ہاں دھان آدھے ہی بیچنا، آدھے رکھ لینا، جب بازار میں دھان کی کمی ہوجائے تب اپنے باقی دھان مہنگے داموں پر بیچنا۔ ـــــ اس طرح تم بہت جلد دولت مند ہو جاؤگے۔ ـــــ میں نے تمھیں فائدے کی بات بتادی ـــــ آگے تمھاری مرضی ـــــ!"

صفدر کو اختر کا مشورہ اچھّا لگا۔ اور اس نے ویسا ہی کیا۔ اس نے آدھا اناج گودام میں جمع کرلیا اور گاؤں والوں سے کہہ دیا ـــــ "اس بار فصل کم ہوتی ہے!"

صفدر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کچھ وقت کے بعد وہ جمع کیے ہوئے اناج کو مہنگے داموں میں بیچ کر خوب دولت مند ہوجائے گا۔ اختر کے مشورے سے صفدر نے آدھے کھیت میں گنّے بھی بو دیے تھے اور گنّے کی فصل سے بھی اُسے

زیادہ آمدنی کی اُمید تھی۔

مگر افسوس بچّو! ـــــ صفدر کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی! ـــــ

"کیوں؟" ـــــ ارحم نے چونک کر دادی سے پوچھا۔

"ہُوا یوں کہ اس سال اتنی زور دار بارش ہوئی کہ گاؤں میں سیلاب آگیا۔ صفدر نے جس گودام میں اناج بھر رکھا تھا، وہاں پانی بھر گیا، جس کی وجہ سے سارا اناج خراب ہو گیا۔

صفدر نے جب گنّے کی فصل دیکھی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ـــــ کیوں کہ گنّے کی فصل بھی پانی کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی!! وہ زمیں گنّے کی کھیتی کے لئے مناسب ہی نہیں تھی!

صفدر کو اب اپنے کیے پر بہت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اُسے اپنے ابّو کی باتیں یاد آنے لگیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ـــــ

اَب صفدر کے پاس اتنے روپئے بھی نہیں بچے تھے کہ وہ اپنے ابّو کا علاج کروا سکے ـــــ لیکن گاؤں کے سبھی لوگ عبدُل کی ایمانداری، شرافت، ہمدردی اور اچھے سلوک

کو بخوبی جانتے تھے ـــــ اس لیے سب نے آپس میں روپئے جمع کر کے صفدر کو دے دیے، جس سے وہ اپنے ابّو کا علاج کروا سکے۔

اب صفدر نے دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ وہ اب کبھی لالچ نہیں کرے گا۔

کہانی ختم کر کے دادی نے فروغ کی طرف دیکھا اور بولیں ـــــ "کیوں فروغ! ـــــ کیا تم اب بھی صفدر کی طرح لالچی بننا پسند کرو گے؟"

"نہیں دادی جان! --- اب میں کبھی لالچ نہیں کروں گا اور نہ ہی اپنے دوستوں کے غلط مشورے مانوں گا"

خُرّم مُراد نگر کے ایک کمپیوٹر سینٹر میں کمپیوٹر سیکھتا تھا۔ وہ روز بس کے ذریعے آتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی خرّم کو گھر لوٹنے میں دیر ہو جاتی یا کہیں جانا ہوتا تو وہ اپنے موبائل فون سے امّی کو بتا دیتا۔ تب اُس کی امّی کو اُس کے لوٹنے کی فکر نہ رہتی۔

ایک روز خُرّم بس پکڑنے کے لیے بس اسٹاپ پر لائن میں کھڑا ہوا تھا۔ بس اسٹاپ پر کافی بھیڑ تھی۔ کچھ دیر بعد ایک بس آئی۔ خُرّم کسی طرح بس میں سوار ہو گیا۔ بس کے

اندر بھی بہت بھیڑ تھی۔ـــــ تبھی اچانک خرّم کو اپنے موبائل فون کا خیال آیا، جو گھر سے نکلتے وقت دھیان سے اپنی جیب میں رکھا تھاــــــ اُس نے جیب دیکھی ــــــ مگر اس میں موبائل فون نہیں تھاــــــ

"ارے میرا موبائل کہاں گیا؟"ــــــ خرّم اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑایاــــــ "لگتا ہے بس میں چڑھتے وقت کسی نے میرے موبائل پر ہاتھ صاف کر دیا!!"

"کیا ہُوا......؟"ــــــ اُس کے پیچھے کھڑے ارشد نے پوچھا۔

خُرّم نے کہاــــــ "لگتا ہے کسی نے میرا موبائل چُرا لیا ہے!"

"جاؤ! پوچھو سب سے!"ــــــ ارشد نے خرّم کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہاــــــ "بڑے آئے موبائل فون جیب میں لے کر چلنے والے!!"

خُرّم نے بس میں کھڑے تین چار لوگوں سے پوچھاــــــ "کیا آپ نے میرا موبائل فون دیکھا ہے؟"ــــــ سب نے یہی کہا کہ ہم موبائل فون کے بارے میں کچھ نہیں جانتے. ہم

نے فون نہیں دیکھا۔

اب تو خُرّم بہت گھبرایا۔ اُسے ایک طرف تو موبائل فون جانے کا افسوس، دوسری جانب ابّو کی ڈانٹ کا خوف!! تبھی اگلا بس اسٹاپ آگیا۔ وہاں سے فیضان بس میں چڑھا۔ فیضان، خرّم کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ فیضان کے پاس بھی موبائل فون تھا۔

فیضان کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھ کر خُرّم کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ فیضان کے پاس پہنچا۔ اُس وقت فیضان موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ فیضان جب بات ختم کر چکا تو خُرّم نے اس سے اپنا موبائل فون چوری ہو جانے کی بات کہی اور کہا ــــــ "ذرا دیر کے لئے تم اپنا موبائل فون مُجھے دے دو!"

"میرا موبائل لے کر کیا کرو گے؟" ــــــ فیضان نے پوچھا ــــــ "پولس کو خبر کرو گے کیا؟"

"نہیں پولس کو خبر نہیں کرنی ہے!" ــــــ خُرّم نے کہا ــــــ "مجھے اپنا موبائل فون پتا لگانے کی ایک ترکیب سوجھی ہے! اس لئے تم سے فون مانگ رہا ہوں۔"

خرّم کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اُس نے کہا ـــــ
"مجھے پورا بھروسہ ہے، میرا موبائل فون چُرانے والا اگر اِسی بس میں موجود ہے تو وہ ضرور پکڑا جائے گا۔"

کچھ سوچ کر فیضان نے خرّم کو اپنا موبائل فون دیتے ہوئے کہا ـــــ "ٹھیک ہے، یہ لو! ـــــ میں بھی دیکھوں کہ تم موبائل چور کو کس طرح پکڑتے ہو!!"

فیضان کا موبائل فون لے کر خرّم نے جلدی سے اپنے موبائل فون کا نمبر ملایا۔ ـــــ نمبر ملاتے ہی بس میں موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ـــــ اپنے آپ گھنٹی بجنے سے بس میں ایک کونے میں کھڑا موبائل چور گھبرا گیا ـــــ اور جیب میں رکھا موبائل فون نکال کر اس کا سوئچ آف کرنے لگا۔ بس میں سوار لوگوں کی نظر موبائل چور پر پڑ گئی۔ ـــــ خرّم بھی لپک کر چور کے پاس پہنچ گیا اور اُسے پکڑ کر زور سے چیخا ـــــ
"یہی ہے موبائل چور!!"

چوری پکڑے جانے سے چور گھبرا گیا۔ بس میں سوار مسافروں نے اُسے پکڑ کر اس کی خوب پٹائی کی اور پھر پولس کے حوالے کر دیا۔ فیضان کے ساتھ ساتھ بس کے

دوسرے مسافروں نے بھی خرّم کی عقل مندی کی تعریف کی اور ساتھ میں نصیحت بھی کی کہ اپنے موبائل فون کو ہمیشہ سنبھال کر رکھا کرے۔

ماجد کی امی اُس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ہر وقت اس کا خیال رکھتیں۔ اس کی ہر اچھی بُری خواہش کو پورا کرتیں۔ بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے ماجد میں کچھ بُری عادتیں آ گئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مار پیٹ کرتا۔ یہاں تک کہ اسکول میں ماسٹر صاحب کو بھی تنگ کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ ماسٹر صاحب جب اُس کی شکایت اس کے گھر بھیجتے تو اُلٹے اس کی امی ماسٹر صاحب کو ہی بُرا بھلا کہتیں۔ اس

کے ابّو اُس کی امّی کو بہت سمجھاتے کہ ماجد کے ساتھ اتنا لاڈ پیار اچھا نہیں مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

ماجد کی چھوٹی بہن صوفیہ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھی۔ پڑھنے کے ساتھ گھر کے کاموں میں امّی کا ہاتھ بٹایا کرتی مگر پھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر امّی کی ڈانٹ پھٹکار سننی پڑتی۔ ماجد بھی اکثر اس کی پٹائی کر دیا کرتا۔ چوں کہ ماجد صوفیہ سے عمر میں بڑا تھا اور وہ اپنی امّی سے بھی بہت پیار کرتی تھی، اس لیے وہ ان کی ہر سختی برداشت کر لیتی۔

ماجد دن بھر اپنے دوستوں کے ساتھ محلّے بھر میں نئی نئی شرارتیں کرتا پھرتا۔ کسی کی سائیکل کی ہوا نکال دیتا۔ کبھی بڈھے بابا کی چھڑی لے کر بھاگ جاتا۔ محلّے میں سب اس کی شیطانیوں سے پریشان تھے۔ اس کے ابّو بہت نیک اور شریف انسان تھے۔ سب سے مل جل کر رہتے۔ کبھی کسی کو کوئی نقصان اور تکلیف نہ پہنچاتے۔ اسی وجہ سے محلّے کے لوگ ماجد کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے۔

ایک روز ماجد اپنے دوستوں کے ساتھ محلّے میں ہی کرکٹ کھیل رہا تھا۔ ماجد نے زور دار شاٹ مارا۔ گیند ندیم

صاحب کے گھر کی کھڑکی میں جاکر لگی۔ ـــــــ کھڑکی کے شیشے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ـــــــ ندیم صاحب نے اس کی شکایت شام کو اُس کے ابّو سے کی۔ ماجد کی اس حرکت پر وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ اُنھوں نے ماجد کی طرف سے ندیمؔ صاحب سے معافی مانگی اور کھڑکی میں نیا شیشہ لگوانے کا وعدہ بھی کیا۔

ابّو نے ماجد کو سمجھاتے ہوئے کہا ـــــــ

"بیٹے! سڑک یا گلی کوچے میں کرکٹ کھیلنا اچھی بات نہیں ہے!! ـــــــ اس کی گیند سے کسی کو چوٹ بھی لگ سکتی ہے ـــــــ اس لیے تم ہمیشہ کرکٹ میدان میں ہی جاکر کھیلا کرو!!"

ماجد کی امّی نے جب سارا ماجرا سُنا تو انھوں نے ماجد کی حمایت کرتے ہوئے کہا ـــــــ

"بچّے تو ایسا کرتے ہی رہتے ہیں! ـــــــ اگر انھیں نقصان کی فکر ہے تو گھر کی کھڑکیوں میں لوہے کی جالی لگوالیں!"

اس طرح ماجد کی ہمّت اور بڑھ گئی ـــــــ!

اتوار کا دن تھا ـــــــ ماجد کے ابّو صبح سویرے ہی دفتر

کے کام سے شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ آج ماجد کو شیطانی کرنے کا اچھا موقع ملا تھا۔ اس نے اپنے کچھ شرارتی دوستوں کے ساتھ مل کر راہ گیروں کو پریشان کرنے کی اسکیم بنائی۔ گھر کے نزدیک ایک تنگ گلی تھی۔ ماجد اور اس کے دوستوں نے مل کر لوہے کا باریک تار گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر مضبوطی سے باندھ دیا اور سب قریب ہی چھپ کر اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ کوئی راہ گیر اس تار میں اُلجھ کر گرے تو وہ سب مل کر تالی بجائیں۔

ماجد کی امّی نے صوفیہ سے کہا ——

"میں رضیہ کے یہاں جا رہی ہوں۔ اُن کا بچّہ کئی دنوں سے بیمار ہے ! —— تم گھر کا خیال رکھنا !!"

صوفیہ نے کہا —— "اچھا امی جان! آپ ہو آئیے !! میں گھر کا خیال رکھوں گی !!"

رضیہ کا گھر گلی کے اس پار تھا۔ ماجد کی امّی جیسے ہی گلی میں داخل ہوئیں، ماجد اور اس کے دوستوں کے باندھے ہوئے تار میں اُلجھ کر منھ کے بل گر پڑیں۔ ان کی چیخ نکل گئی۔ یہ سب دیکھ کر ماجد اور اس کے شرارتی دوست ڈر کے

مارے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

امّی کی چیخ سُن کر صوفیہ گھر سے باہر آئی۔ دیکھا کہ اس کی امّی زمین پر بے ہوش پڑی ہیں۔ سر اور مُنھ سے خون بہہ رہا ہے۔ اسپتال دُور تھا۔ صوفیہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا ـــــــ مگر دُور تک کوئی دکھائی نہ دیا۔ کچھ خیال آتے ہی ندیم صاحب کے گھر کی سمت دوڑ پڑی۔ اور جاکر ان کو بتایا۔ ندیم صاحب فوراً چلے آئے۔

انھوں نے دیکھا تو خون بہت بہہ چکا تھا۔ آس پاس کوئی رکشا بھی نہیں تھا، جس سے اس کی امّی کو جلد اسپتال لے جایا جاسکے۔ فوراً ندیم صاحب اپنی کار لے آئے۔ اور صوفیہ اور اس کی امّی کو اسپتال لے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے مریض کو دیکھ کر بتایا کہ خون بہت بہہ چکا ہے۔ دو بوتل خون کی فوراً ضرورت پڑے گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مریض کے گروپ کا خون ان کے اسپتال میں موجود نہیں ہے۔

صوفیہ نے فوراً کہا ـــــــ "ڈاکٹر انکل! آپ میرا خون لے لیجیے، مگر میری امّی کو اچھا کر دیجیے!!"

ڈاکٹر صاحب نے صوفیہ کو سمجھایا ـــــ "چھوٹے بچوں کا خون نہیں لیا جاتا۔"

ندیم صاحب نے یہ سن کر ڈاکٹر سے کہا ـــــ

"ڈاکٹر صاحب! آپ میرے خون کی جانچ کر لیں۔ شاید میرا خون ان کے خون کے گروپ کا ہو!!"

جانچ میں خون کا گروپ مل گیا۔ فوراً ندیم صاحب کا دو بوتل خون مریض کو چڑھایا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی صوفیہ کی امی کو ہوش آ گیا۔ انھوں نے حیرت سے اپنے آس پاس دیکھا، لیکن ساری بات سمجھتے انھیں دیر نہیں لگی۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ انھوں نے پاس کھڑی صوفیہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

شام کو ڈاکٹر صاحب نے انھیں اسپتال سے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ندیم صاحب صوفیہ اور اس کی امی کو لے کر جس وقت گھر پہنچے، تبھی اس کے ابو بھی شہر سے واپس آ گئے۔ ماجد بھی گھر میں موجود تھا۔ سر میں پٹی بندھی دیکھ کر ابو کو بڑی حیرانی ہوئی۔ اس کی امی نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ندیم صاحب نے اس کے ابو کو بتایا کہ آج اگر صوفیہ انھیں

وقت پر نہ بُلا کر لاتی اور اسپتال لے کر جانے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو شاید اُس کی امّی کا بچنا مشکل ہو جاتا۔

ماجد ایک طرف خاموش کھڑا ندیم انکل کی باتیں غور سے سُن رہا تھا۔ مگر اُس کے چہرے پر شرارت نہیں تھی، بلکہ ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

مثالی دوست

اُس دن لیئق اپنے کلاس میں کافی دیر سے پہنچا۔
ماسٹر صاحب نے جب اُس سے دیر سے آنے کی وجہ معلوم کی تو
اُس نے فوراً جواب دیا ——

"سر! میں اپنے وقت پر ہی اسکول آرہا تھا۔
اچانک راستے میں ایک کنویں پر بہت بھیڑ دیکھی! ——
یہ جاننے کے لیے کہ وہاں بھیڑ کیوں جمع ہے —— میں
کنویں کے نزدیک گیا —— تب معلوم ہُوا کہ ذاکر کا چھوٹا

بھائی شاکر کنویں میں گر گیا ہے۔ سبھی اُسے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ــــــ میں بھی اس کو نکالنے میں مَدَد کرنے لگا ؛ اِس لیے دیر ہو گئی !!"

"تو کیا شاکر کو کنویں سے نکال لیا گیا ؟ ــــــ ماسٹر صاحب نے لئیق سے پوچھا۔

" نہیں سر! ــــــ میرے آنے تک اُسے نہیں نکالا جا سکا تھا۔" ــــــ لئیق نے جواب دیا۔

ذاکر بھی اسی کلاس میں پڑھتا تھا۔ لئیق کی بات سُن کر وہ گھبرا گیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہُوا اَور روتے ہوئے اُس نے ماسٹر صاحب سے پوچھا ــــــ

" سر! میں اپنے بھائی کو دیکھنے چلا جاؤں ؟"

ماسٹر صاحب نے ذاکر کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔

ذاکر تیزی سے گھر کی سمت دوڑ پڑا۔ ــــــ پہلے اُس نے اُس کنویں کی طرف دیکھا، جس میں لئیق نے کہا تھا کہ اُس کا بھائی گر گیا ہے ــــــ لیکن جب اُسے وہاں بھیڑ نہ دکھائی دی تو اُس نے سوچا کہ بھائی کو کنویں سے نکال کر گھر پہنچا دیا گیا ہو گا۔

ذاکر دَوڑتا ہُوا گھر پہنچا ـــــ مگر گھر کے دروازے پر تالا لگا ہُوا تھا ـــــ اب وہ اور زیادہ گھبرایا ـــــ وہ سوچنے لگا ـــــ ہوسکتا ہے کنوئیں میں گرنے کی وجہ سے اس کے بھائی کے پیٹ میں زیادہ پانی چلا گیا ہو اور اُسے اسپتال لے گئے ہوں ـــــ وہ فوراً اسپتال کی جانب دوڑ پڑا۔

اُس نے سارا اسپتال چھان مارا مگر اُسے اپنا بھائی کہیں دکھائی نہ دیا۔ ـــــ مایوس ہوکر ذاکر گھر واپس چل دیا۔ راستے میں اُسے چچا مطلوب مِل گئے۔ ذاکر کو دیکھ کر چچا مطلوب نے پوچھا ـــــ

"ارے ذاکر! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ ـــــ اسکول سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟"

"نہیں چچا جان! ـــــ میں اسکول میں ہی تھا۔ لئیق نے بتایا کہ شاکر کنوئیں میں گر گیا ہے! ـــــ اس لیے ماسٹر صاحب سے اجازت لے کر اُسے دیکھنے آیا تھا، لیکن گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے ـــــ اسپتال گیا، وہ وہاں بھی نہیں ہے!!" ـــــ لئیق نے جواب دیا۔

یہ سُن کر چچا مطلوب زور سے ہنسے ــــــ پھر بولے ــــــ "ارے تو کس کے بہکاوے میں آگیا ــــــ لئیق تو اوّل درجے کا جھوٹا اور شرارتی لڑکا ہے! ــــــ تیرا بھائی شاکر تو اپنی امّی کے ساتھ بازار گیا تھا ــــــ ابھی کچھ دیر پہلے ہی دونوں واپس آئے ہیں!!"

چچا مطلوب کی بات سُن کر ذاکر گھر کی طرف تیزی سے دوڑا۔ اس کا بھائی شاکر گھر کے باہر کھیل رہا تھا ــــــ شاکر کو کھیلتا دیکھ کر وہ امّی سے ملے بغیر ہی اپنے اسکول واپس چلا گیا۔

اسکول پہنچ کر معلوم ہُوا آدھا گھنٹے پہلے اسکول بند ہو چکا ہے۔ ذاکر اپنا بستہ لینے کلاس میں چلا گیا ــــــ مگر اُس کو بستہ کہیں نہ مِلا۔ اپنا بستہ نہ پاکر وہ رونے لگا۔

اسکول کے چوکی دار نے ذاکر کو روتے دیکھا تو پوچھا ــــــ "کیا بات ہے؟"

ذاکر نے بتایا ــــــ "میرا بستہ نہیں مل رہا ہے!"

"روتا کیوں ہے؟ ــــــ تیرا بستہ لئیق لے گیا ہے، ابھی وہ راستے میں ہی ہوگا!"

ذاکر لئیق کی تلاش میں اُس کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ آرام سے جاتے ہوئے دکھائی دیا۔ ذاکر کو دیکھ کر لئیق مسکرایا......

پھر اس کا بستہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ______

"لے سنبھال! اپنا بستہ!!"

اپنا بستہ لیتے ہوئے ذاکر نے کہا ______ "تو اتنا بڑا جھوٹ بھی بول سکتا ہے، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"کیا کرتا دوست؟...... ماسٹر صاحب سے کچھ تو بہانا بنانا ہی تھا...... ورنہ مجھے اُن کی مار کھانی پڑتی!!" ______ لئیق نے ہنس کر کہا۔

"مجھ سے بات مت کر!...... تجھے کیا معلوم تیرے جھوٹ کی وجہ سے مجھے کتنی پریشانی ہوئی!!"

اس کے بعد ذاکر اور لئیق میں کوئی بات نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر ذاکر نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد باہر کھیلنے چلا گیا۔ کھیل کر واپس آیا تو اُسے ہوم ورک کرنے کی یاد آئی۔ اُس نے اپنا بستہ کھولا۔ لیکن یہ کیا......؟ ______ بستے سے پنسل، ربر، کٹر سب غائب!

ذاکر نے فوراً لئیق کے گھر جا کر اس سے پوچھا ______

"میری پنسل، ربر اور کٹر کہاں ہیں......؟"

یہ سُن کر لئیقؔ ناراض ہوتے ہوئے بولا ــــــ "ایک تو میں تیرا بستہ اسکول سے لے کر آیا اور تُو مجھے ہی چور بنا رہا ہے!"

لئیقؔ کا جواب سُن کر ذاکرؔ خاموشی کے ساتھ گھر لوٹ آیا اور اپنی امّی کو سب کچھ بتا دیا۔

امّی نے سمجھاتے ہوئے کہا ــــــ "بیٹا! تم فکر مت کرو۔ میں تمھیں بازار سے اور لا دوں گی!"

دن گزرتے گئے ــــــــــــ

اب سالانہ امتحان قریب آگیا۔ اچانک لئیقؔ اسکول سے غیر حاضر رہنے لگا۔ سب امتحان کی تیاّری میں مصروف تھے، اس لیے کسی کا دھیان لئیقؔ کی طرف نہ تھا ــــــ لیکن ذاکرؔ کو لئیقؔ کے اسکول نہ آنے سے فکر تھی ــــــ ذاکرؔ نے فیصلہ کیا کہ وہ لئیقؔ کے گھر جاکر معلوم کرے گا کہ لئیقؔ اسکول کیوں نہیں آرہا ہے؟

ایک دن ذاکرؔ لئیقؔ کے گھر پہنچا ــــــ دروازے پر جاکر دستک دی تو لئیقؔ کی امّی نے دروازہ کھولا۔ ذاکرؔ کو دیکھ کر

وہ بولیں ——— "ارے ذاکر تم! —— آؤ اندر آؤ!!"

"لئیق کہاں ہے؟ آنٹی!...... میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ وہ اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے، جب کہ امتحان شروع ہونے میں چند روز ہی باقی رہ گئے ہیں!!" ——— ذاکر نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

"ارے! پہلے اندر تو آؤ!!" ——— لئیق کی امّی ذاکر کو لئیق کے کمرے میں لے گئیں، جہاں وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

"لئیق کئی دن سے سخت بیمار ہے ——— اسی وجہ سے یہ اسکول بھی نہیں جا پایا۔ ——— مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے کہ اب یہ امتحان کی تیاری کیسے کرے گا؟" ——— لئیق کی امّی نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

ذاکر نے فوراً کہا ——— "آنٹی! آپ بالکل فکر نہ کریں، میں لئیق کو سب تیاری کرا دوں گا"

لئیق بستر پر لیٹا ہوا چپ چاپ امّی اور ذاکر کے درمیان ہو رہی گفتگو کو سُن رہا تھا۔

"لیکن بیٹا! تمھارا گھر تو دُور ہے، تم روز کیسے آیا کرو گے؟"
——— لئیق کی امّی نے کہا۔

"دوپہر کو کھانا کھا کر آجایا کروں گا۔۔۔۔۔اسی بہانے میں تھوڑا ٹہل لیا کروں گا" ــــــــ ذاکر نے جواب دیا۔

اس طرح ذاکر نے کئی روز تک لئیق کو امتحان کی تیاری کرائی۔

سالانہ امتحان کے نتیجے کا اعلان ہُوا۔ ــــــــ لئیق اور ذاکر دونوں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ لئیق اپنی کامیابی پر مٹھائی لے کر ذاکر کے گھر پہنچا ــــــــ

ذاکر نے لئیق کو مبارک باد دی تو لئیق کی گردن شرم سے جُھک گئی ــــــــ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ذاکر نے لئیق کو گلے سے لگا لیا۔۔۔۔۔۔!

جاوید اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جاوید کے ابّو
چاہتے تھے کہ جاوید اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور کچھ بن کر
دکھائے۔ اس لئے وہ اُسے سمجھایا کرتے ـــــ
"علم حاصل کرنا ہر انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔
علم کے بغیر انسان اچھی طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔"
لیکن جاوید پڑھنے لکھنے سے جی چُراتا۔ اُس پر ابّو کی
بات کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ اُسے تو بس اِدھر اُدھر گھومنے، دوڑنے

کو بے وجہ پریشان کرنے اور نئی نئی شرارتیں کرنے میں مزا آتا تھا۔

صُبح سویرے جب اُس کے ابو اپنے کام پر چلے جاتے تو جاوید بے لگام گھوڑے کی طرح گھر میں خوب ہُڑدنگ کرتا۔ اپنی چھوٹی بہنوں کو خوب تنگ کیا کرتا۔ دل چاہتا تو اسکول چلا جاتا، نہیں تو پُورا دن اسی طرح گھر میں اور گھر سے باہر محلّے میں شرارتیں کرتا پھرتا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے امّی بھی اس سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ امّی کے بے جا لاڈ پیار نے اسے اور زیادہ بگاڑ دیا تھا۔

ابّو اگر ڈانٹ کر اسکول جانے کے لیے کہہ کر جاتے تو وہ اسکول جانے کے بہانے اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے نِکل جاتا ______ کسی کے کھیت سے ککڑی چُراتا تو کسی کے باغ سے کچّے آم توڑتا۔ ______ بس اِنہی شرارتوں میں اس کا سارا دن نکل جاتا اور شام ہوتے ہی محلّے میں ٹیلی ویژن دیکھنے چلا جاتا اور دیر رات کو گھر میں داخل ہوتا۔ جب کبھی ابّو اس کی ان حرکتوں پر اُسے سزا دیتے تو ماں کی ممتا اس کی ڈھال بن جاتی۔ امّی اُلٹے ابّو پر ہی ناراض ہوتیں۔

ایک روز جاوید صبح کو اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ راستے میں اُسے ایک نئی چمچماتی ہوئی کار کھڑی دکھائی دی۔ جس پر بہت ہی خوب صورت اسٹیکر لگے ہوئے تھے۔ پھر کیا تھا، اس کے دماغ میں شیطان جاگ گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا، ـــــ "کیوں نہ اس کار پر سے کچھ اسٹیکر چھُٹا لیے جائیں ـــــ!"

اِدھر اُدھر دیکھا ـــــ کار کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ موقع غنیمت جان جلدی جلدی کار پر سے اسٹیکر چھُٹانے لگا ـــــ مگر اُس کی بد قسمتی کہیے ـــــ کار کا مالک جو کہیں قریب میں ہی گیا ہوا تھا، واپس لوٹ آیا۔ اور جاوید کو اسٹیکر چھٹاتے دیکھ لیا۔ فوراً دوڑ کر جاوید کو پکڑ لیا۔ جاوید نے اُس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن اس کی سب کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ کار کے مالک نے جاوید کو لے جاکر ایک پُرانی کوٹھری میں جس میں اس کی گائے کے کھانے کے لیے بھُوسا بھرا رہتا تھا، بند کر دیا۔

دن بھر جاوید کو اُس بھُوسے کی پُرانی اور بدبو دار کوٹھری

میں بند رہنا پڑا۔ شام کو کسی نے اُس کے ابّو کو خبر دی تو وہ بڑی مشکل سے کار کے مالک سے معافی مانگ کر اُسے چھڑا کر لائے۔

گھر آتے ہی جاوید کی امّی نے، جو بڑی بے چینی سے اُس کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں، جاوید کو گود میں اُٹھا لیا۔ ابّو نے سارا ماجرا بتایا تو وہ اُلٹے کار کے مالک کو ہی کوسنے لگیں ——— "بچّے تو شرارتیں کرتے ہی ہیں۔ ——— جاوید نے ہی کون سا اتنا بڑا جرم کر دیا! ——— اگر کچھ اسٹیکر چھٹا بھی لیے تھے تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ ——— ظالم نے میرے بچّے کو کوٹھری میں بھوکا پیاسا بند کیوں کیا ——— اپنے اسٹیکروں کے پیسے لے لیتا ——— !"

جاوید کے ابّو نے اُنھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر سب بےکار! ——— اُن کے آگے ابّو کی ایک نہ چلی ——— انھوں نے جاوید کو اس حرکت پر ڈانٹنے کے بجائے مٹھائی کھانے کے لیے پیسے اور دے دیے۔!!

اِنھی سب باتوں سے جاوید کے حوصلے بڑھتے چلے گئے، وہ جان گیا کہ امی اس کے ساتھ ہیں۔ وہ کچھ بھی کر لے، کوئی
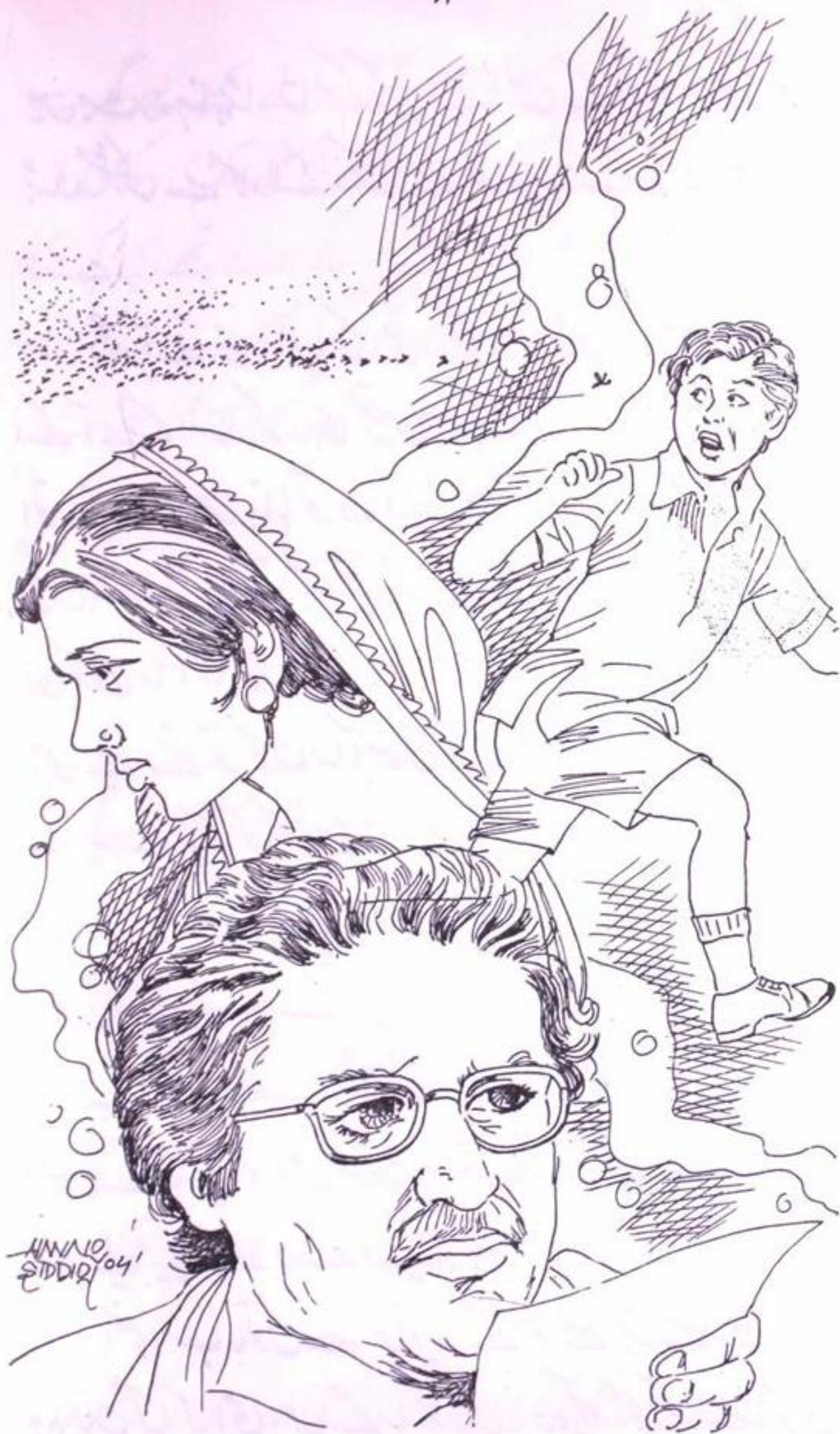
اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

جاوید کا اسکول اس کے گھر سے تھوڑی ہی دُور تھا۔ جس کے راستے میں نیم کا بہت پُرانا اور بڑا پیڑ تھا۔ کچھ دنوں سے اس پیڑ پر شہد کی مکھیوں نے ایک بڑا سا چھتہ لگا لیا تھا۔ جاوید اسکول آتے جاتے اس چھتّے کو بڑی غور سے دیکھا کرتا، جو دن بہ دن بڑا ہوتا جارہا تھا۔

آج صبح بھی جب وہ اسکول جارہا تھا تو راستے میں چھتہ دکھائی دیا۔ وہ رُک کر اس چھتے کو دیکھنے لگا۔ بہت ساری مکھّیاں ایک دوسرے پر بیٹھی ہوئی تھیں، ـــــ کچھ اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھیں ـــــ جاوید کو شرارت سوجھی ـــــ اُس نے فوراً سڑک کے کنارے پڑا پتھر اٹھا کر مکھیوں کے چھتّے پر مار دیا۔

پھر کیا تھا؟ ـــــ مکھیوں کے چھتے میں طوفان آگیا۔ بہت سی مکھّیاں چھتہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر اُڑنے لگیں اور بے چینی کے عالم میں اپنے گھر پر حملہ کرنے والے دشمن کو تلاش کرنے لگیں۔

کچھ مکھیوں نے جاوید کو دیکھ لیا، جو خوش ہوکر

تالی بجا رہا تھا۔ ـــــــ فوراً مکھیاں اُڑ کر جاوید کے نزدیک پہنچ گئیں۔ جاوید ڈر کے مارے بہت تیزی سے گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ مکھیاں بھی اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ جاوید دوڑتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ ـــــــ گھر میں داخل ہو کر اُس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

امّی نے جب سارا ماجرا سُنا تو انھوں نے جاوید کو اپنی گود میں چھپا لیا۔

لیکن شہد کی مکھیاں اپنا گھر برباد کرنے والے کو کہاں چھوڑتی ہیں۔ جاوید کے گھر کا دروازہ بند دیکھ کر وہ اُڑ کر صحن میں ہوتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئیں، جہاں جاوید اپنی امّی کی گود میں آرام سے بیٹھا ہُوا تھا۔ ساری مکھیوں نے مل کر اچانک اُس پر حملہ بول دیا۔ ـــــــ امّی نے جاوید کو بچانے کی کوشش کی تو مکھیوں نے انھیں بھی نہیں بخشا۔ کاٹ کاٹ کر دونوں کو بے دم کر کے شہد کی مکھیاں خوش ہوتی ہوئی جنگل کی طرف اُڑ گئیں۔

Dhanak-Ke-Rang

URDU SHORT STORIES FOR CHILDREN

BY : AZIZULLAH KHAN "AZIZ"

"عزیزاللہ خاں عزیزؔ سنبھل کے نوجوان قلم کاروں میں سے ہیں۔ "دھنک کے رنگ" ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی پہلی دستاویز ہے جس کا تعلق ادبِ اطفال سے ہے انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بچوں کے افسانوی ادب کو وسیلہ بنایا ہے، جس میں پیش رفت کے کافی امکانات ہیں۔ اِس سے قبل وہ "اوراقِ سخن" کے ذریعے اپنی تدوینی صلاحیتوں کا اظہار کر چکے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا بظاہر اتنا آسان نظر آتا ہے گویا کہ بچوں کا کھیل ہو۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے قلم کار اس طرف متوجہ ہی نہ ہوئے اور بہت سے ناکام ہو کر رہ گئے۔ اس آزمائش میں بچوں نے انھیں ناکام کر دیا۔ "دھنک کے رنگ" کے مطالعے سے مسرت ہوتی ہے کہ عزیزؔ کو ادبِ اطفال خصوصاً افسانوی ادب کے فنی تقاضوں اور نزاکتوں کا پورا ادراک ہے اور اس آگہی کا ثبوت پوری ہنرمندی سے انھوں نے دیا ہے۔"

محمود علی سنبھلی